بشیر احمد ڈار

افلاطون اور اُس کا فلسفۂ اخلاق

افلاطون کے ہاں اس بنا پر انسانوں کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک طرف وہ ہیں جو اعیان پر یقین نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ اس زمانے میں بھی موجود تھے اور آج بھی ہیں جو پورے عالمانہ انداز میں یہ دعوے کرتے ہیں کہ عدالت اور خوبصورتی کا کوئی مقررہ معیار نہیں اور جو اپنے اس اعتقاد کے ثبوت میں تاریخ سے بے شمار مثالیں پیش کرتے ہیں کہ انصاف و خوبی کے ایک زمانے کے معیار دوسرے زمانے میں نہیں چلتے۔ افلاطون کے خیال میں ان لوگوں کے دلائل کسی حد تک درست ہیں کیونکہ محسوسات کے معاملہ میں کوئی چیز مستقل نہیں اور نہ ان کے متعلق کسی غیر متغیر اصول وضع کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت کا صرف ایک ناقص پہلو ہے۔ ان تمام تغیرات کے باوجود ہر زمانے میں لوگوں کے ذہن میں عدالت اور خوبی کے تصورات موجود تھے اور ان ہی کی روشنی میں وہ ظلم و انصاف، خوبی اور بدصورتی، نیکی اور بدی کے اعمال کی تمیز کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام تغیرات کی تہ میں کچھ نہ کچھ ثبات ضرور موجود ہوتا ہے، کثرت کے اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی وحدت میں یکرنگی اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اگر عدالت کے عین کے وجود حقیقت کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بعد لازمی طور پر اس عین کی ماہیت معلوم کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا اور پھر اس ماہیت کے مطابق جو ایک انسان اپنے قلبی ارادات اور معاشرتی حالات کے تقاضوں کی روشنی میں قائم کرتا ہے۔ وہ اپنے اعمال کو ڈھالتا ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ کمال حاصل کرنے کی کوشش میں منہمک رہتا ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس اعیان کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے اور دعوے کیا جائے کہ مختلف اعمال و رسوم کی بنیاد کسی مستقل اصول پر مبنی نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انصاف و عدل، خوبی اور بدی کا کوئی غیر متغیر نصب العین موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ محض رسم و رواج کی پابندی اور معاشرتی زجر و توبیخ کے خوف سے ایسا شخص ان اعمال کی پیروی کرے۔ لیکن معاشرہ ایسے اشخاص کے اقوال و اعمال پر بھروسہ نہیں کر سکتا کیونکہ ان کی سیرت میں تلون کی وجہ سے کوئی پائداری نہیں ہوتی۔ اگر وہ عمل جو آج اچھا ہے اور کل برا ہو سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ افراد محض معاشرے کے حدود و پابندیوں سے مجبور ہو کر ایسے اعمال کے سامنے سر تسلیم خم کریں؟ ایسی حالت میں معاشرے میں ابتری اور اخلاقی نراج کا پیدا ہونا یقینی ہے۔

پس افلاطون کے خیال میں صحیح اور صحت مند اخلاقی زندگی کے لئے اعیان کے وجود کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ اس نے ان اعیان اور مختلف اعمال و اشیاء کے تعلق کو بیان کرنے کے لئے مختلف تشبیہات استعمال کی ہیں لیکن ان

سب میں اس کا اخلاقی مقصد جھلکتا ہے۔ کبھی وہ ان اعیان کو بطور نمونہ و مثال پیش کرتا ہے جو جنت میں یا کسی اور جگہ موجود ہیں اور جن کی روشنی میں ہم اپنے اعمال کی تشکیل کرتے ہیں۔ کبھی ان کا جلوہ انسانی روح پر وارد ہوتا ہے جس کے باعث ان کی صفات کا عکس ہمارے اعمال اور ہماری سیرت میں منعکس ہوتا ہے۔ ان اعیان کے وجود اور ان کی اخلاقی نصب العینی حیثیت کو تسلیم کیا جائے تو افلاطون کسی خاص تشبیہ کو سنوانے پر مصر نہیں کیونکہ تشبیہ تو آخر تشبیہ ہے، وہ حقیقت نہیں محض حقیقت اور واقعیت کو سمجھانے کا ایک ناقص طریقہ ہے۔ مکالمات میں مختلف جگہوں پر اس نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک بلند اخلاق کے انسان کو ان اعیان کا مشاہدہ ہوتا ہے اور مشاہدہ کرتے ہی وہ ان کو یوں پہچان لیتا ہے گویا کہ یہ ان سے پورا پورا واقف ہے۔ یہی افلاطون کا نظریۂ حافظہ ہے اس کے مطابق انسانی روح جسمانی رشتے سے پہلے ایک ایسی دنیا میں بستی تھی جہاں وہ ان اعیان کے وجود سے پوری طرح خبردار تھی۔ اب اگر کبھی کبھار اسے ان اعیان کا دھندلا سا عکس مشہودات اور محسوسات میں نظر آجاتا ہے تو وہ فوراً اسے پہچان لیتی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر افلاطون کے خیال میں ہماری اخلاقی زندگی کا دار و مدار ہے۔ یہ دنیائے اعیان حقیقی ہو یا محض ہمارے تخیل کی تخلیق، اس کا وجود اخلاقی زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ذیل کی مثال دیکھئے۔ ایک آدمی کے سامنے ایک مادی لذت پیش کی جاتی ہے۔ فطرتاً اس کی خواہش ہوگی کہ وہ اچک کر اس سے پوری پوری لذت اٹھائے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کچھ دیر کے لئے رک جاتا ہے۔ اس مختصر سے وقفہ کے دوران میں وہ اپنے تجربات وغیرہ کی روشنی میں معاملات کو سوچتا ہے کہ آیا اسے اس لذت کو ترک کر دینا چاہیئے یا نہیں۔ خواہ وہ فیصلہ اختیار کرنے یا ترک کرنے کے حق میں دے، خواہ اس کا فیصلۂ ترک و اختیار واقعتہً اس کو لذت یا رنج پہنچانے کا باعث ہو یا نہ، ہر حالت میں سوچ بچار اور رکنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے قلب میں ایک "جذبۂ اعتدال" پیدا ہونا شروع ہوگا جس سے وہ لذت محسوس کرے گا۔ آہستہ آہستہ اس کے قلب و ذہن میں اس "اعتدال" کا ایک نقشہ قائم ہونا شروع ہوگا جس کے خدوخال اور نقش و نگار اس کے دل کی آنکھوں کے سامنے واضح اور واضح تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اسے اس تصور سے اتنی دلچسپی پیدا ہوگی کہ اس کو مادی لذتوں اور جسمانی راحتوں میں کوئی کشش محسوس نہ ہوگی۔ گویا اس "تصور" کی محبت نے اس کے قلب و جگر سے دنیاوی زندگی کی ساری لذتوں کو یکسر نکال دیا۔ اس طرح افلاطون کی نگاہ میں اعیان کے وجود پر ایمان لانے سے اخلاقی زندگی میں گہرائی اور وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی مثال حضرت یوسف کی زندگی سے ملتی ہے۔ جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف کو برائی کی طرف ترغیب دی تو بحیثیت انسان اس نفسی جذبے کی کشش آپ پر غالب آجاتی لیکن آپ کے قلب میں چند بنیادی اعتقادات کا تصور موجود تھا۔ اس تصور نے آپ کا دامن تھام لیا۔ افلاطون کے الفاظ میں یہ تصور "عین نیکی" تھا جسے قرآن نے اپنے الفاظ میں "خدا کی برہان" کا نام دیا ہے۔

ولقد ھمت بہ، وھم بھا لولا ان رآ برھان ربہ (۱۲ : ۲۴) — وہ عورت اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔

برہان کے عام معنی دلیل اور حجت کے ہیں۔ ایک جدید مفسر اس کی یوں تشریح کرتا ہے۔ " رب کی برہان سے مراد خدا کی سمجھائی ہوئی وہ دلیل ہے جس کی بنا پر حضرت یوسفؑ کے ضمیر نے ان کے نفس کو اس بات کا قائل کیا کہ اس عورت کی دعوت عیش قبول کرنا تجھے زیبا نہیں" لیکن قرآن نے برہان کے ساتھ لفظ "دیکھنا" لگا کر اس کے لغوی معنوں کی حقیقت بالکل بدل ڈالی ہے۔ دلیل کا سمجھایا جانا یا پیش کرنا وغیرہ تو کہا جاتا ہے لیکن دلیل کا دیکھنا ایک مختلف تجربہ ہے۔ افلاطون نے مکالمہ جمہوریت (۵۰۷) میں "دید" کو تمام حسوں میں سے افضل ترین تسلیم کیا ہے اس طرح اس کے نزدیک اعیان کا علم روح کو ایسی حس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جو اس جسمانی " دیکھنے" یا آنکھ سے مشابہ ہے۔ افلاطون کے الفاظ میں ہم ان اعیان یا تصورات کو عقل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔" روح آنکھ کی طرح ہے جب وہ اس چیز پر پڑتی ہے جس پر صداقت اور وجود چمکتے ہیں تو روح دیکھتی ہے اور سمجھتی ہے اور عقل و دانائی سے منور ہو جاتی ہے"۔ (مکالمۂ جمہوریت ۵۰۸ [1]) یہی وہ مشاہدۂ اعیان ہے جس کو قرآن نے اس جگہ مشاہدۂ برہان کے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ نیکی اور صداقت کے اس منور تصور کو دیکھ کر حضرت یوسف کے لئے بدی کیطرف راغب ہونا ناممکن تھا۔ جتنی زیادہ قوت کسی آدمی میں اس " تصور خیر" کے مشاہدے کی ہوگی اتنا ہی اس کا دامن نیکیوں اور فضائل سے بھرپور ہوگا۔

ان تمام تصورات اور اعیان میں سب سے بلند ترین تصور " عین خیر" کا ہے جو نہ صرف اخلاقی زندگی کے لئے سب سے بلند ترین نصب العین۔ ہے بلکہ انسانی اور خدائی تخلیق میں بطور نمونہ اور مثال کام آتا ہے۔ سقراط نے مختلف فضائل پر بحث کی تھی اور اسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے افلاطون نے بھی عدالت، جرأت اور ضبط نفس جیسے فضائل کا تجزیہ کیا۔ سوال یہ تھا کہ ان اعمال کو ہم فضائل میں کیوں شمار کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ تھا کہ ان سب اعمال میں خیر کا وجود یا تصور شامل ہے اور وہی مقصد حیات و عمل ہے۔ اگر تمام مختلف فضائل درحقیقت اس خیر کے مختلف وقتی مظاہر ہیں جو مختلف اعمال میں نظر آتے ہیں تو یہ خیر ہی ہمارے اعمال کا مدعا اور مقصد ہوا۔ اگر ہم اس سے پوری طرح واقف ہیں تو ہمیں کسی اور علم کی ضرورت نہیں۔ لیکن افلاطون نے سقراط کے اس نظریئے کو بڑھا کر یہ دعویٰ کیا کہ اگر عین خیر ہمارے اعمال کے دائرہ میں مقصد اعلیٰ ہے تو اسی طرح اخلاق کے علاوہ ساری کائنات اسی نصب العین کے ارد گرد حرکت کرتی ہے۔ وہ صرف ہمارے اخلاقی اعمال

---

[1] دیکھئے جوویٹ کا ترجمہ مکالمات جلد اول صفحہ ۷۶۹، ۷۷۰

کی نہیں بلکہ ساری زندگی اور وجود کا محور، آغاز و انجام ہے۔ یہی حقیقت مطلقہ ہے۔ اس تغیر پذیر دنیائے مشاہدات و محسوسات کی تمام حقیقت اس کی وجہ سے ہے۔ لیکن یہ عین خیر ہے کیا چیز؟ افلاطون اس کے متعلق کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا اور اس کی وجہ عیاں تھی۔ مشاہدات حسی کی تشریح ہو سکتی ہے لیکن اس حقیقت کا بیان کرنا ہمارے منطقی ذہن کے لئے ممکن نہیں جو ان مشاہدات کے ماورا جاری و ساری ہے اور جس کی بنا پر ہی یہ دنیائے کون و فساد اپنا وظیفۂ حیات پورا کرتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ مکالمہ جمہوریت (۵۰۶ء) میں وہ تسلیم کرتا ہے کہ خیر کی تعریف ممکن نہیں۔ گلوکن سقراط سے التجا کرتا ہے کہ اگر وہ خیر کی تشریح اس طرح کر دے جس طرح اس نے عدالت، ضبط نفس اور دوسرے فضائل کی ہے تو وہ اس کے شکر گذار ہوں گے۔ اس کے جواب میں سقراط یہی کہتا ہے کہ اس کی ویسی تعریف ممکن نہیں[1]۔ تاہم افلاطون نے اس تصور کی وضاحت کرنے کے لئے کئی طریقے اختیار کئے ہیں۔

(۱) یہ تمام انسانی کوشش کا آخری مقصد و مدعا ہے جس کے حصول کے لئے ہم دن رات جد و جہد کرتے ہیں۔ وہ اول بھی ہے اور آخر بھی۔ جب کبھی ہم کوئی عمل کرتے ہیں تو اس خیر کا تصور ہمارے سامنے موجود ہوتا ہے خواہ دھندلا اور غیر واضح کیوں نہ ہو۔ اسی کی راہنمائی اور ہدایت سے ہم اخلاقی حیثیت سے بلند ترین درجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود صحیح اور واضح تصور خیر ہماری تمام اخلاقی زندگی کا انجام ہے جب ہم منزل بہ منزل اخلاقی فضیلتوں کا اکتساب کرتے چلے جاتے ہیں تو ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب یہ تصور خیر اپنی پوری تجلی سے ہمارے سامنے موجود ہوتا ہے وہ اول ہوتے ہوئے بھی آخر میں میسر آتا ہے اور آخر میں ہوتے ہوئے بھی ہماری تمام اخلاقی جد و جہد کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے مکالمہ جمہوریت میں افلاطون نے اس تصور کو مختلف منزلوں میں واضح کیا ہے۔ پہلے باب میں سقراط کی پیروی میں افلاطون نے خیر کو انفرادی زندگی کا مقصد قرار دیا ہے، جس کی صحیح نوعیت کا علم اسے اپنی فطرت اور اپنے مختلف اعمال کے تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل اس وقت شروع ہوتی ہے۔ جب انسان کو ایک معاشرتی وجود کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ اس منزل میں اس کا خیر وہ عمل ہے جس سے وہ اس معاشرے میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔ لیکن معاشرتی زندگی افلاطون کی نگاہ میں آخری منزل نہیں۔ تیسری منزل وہ ہے جب ایک فلسفی اس عالم تغیر و تبدل سے بے نیاز ہو کر عالم ثبات سے متعلق ہو جائے۔ وہ حسی مشاہدات سے باہر ہو کر روحانی مشاہدات اور ازلی و ابدی تجربات کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں اخلاق اور سیاست ایک ہو جاتے ہیں۔

(۲) ایک جگہ افلاطون نے تصور خیر کو سمجھانے کے لئے سورج کی مثال دی ہے۔ چونکہ سورج تمام حرارت کا منبع ہے جس پر تمام اشیاء کا نشوونما منحصر ہے، اس لئے وہ تمام اشیاء کے وجود کی علت ہے۔ اسی طرح روشنی کا مصدر ہونے

---

[1] دیکھئے جوویٹ کا ترجمہ مکالمات جلد اول صفحہ ۷۶۶، ۷۶۵

کی وجہ سے وہ تمام خارجی اشیا کی صورتوں اور رنگوں کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح ہم ان کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تصورِ خیر کی بھی یہی حیثیت ہے[۱] وہ تمام کائنات کی مختلف اشیاء کے وجود کی علت بھی ہے اور ان تمام لوگوں کے علم کی وجہ جو ان اشیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ وجود اور علم دونوں سے ماورا ہے کیونکہ ان دونوں کا آغاز اسی سے ہے۔ اس مثال سے افلاطون یہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ تصورِ خیر نہ صرف اس خارجی کائنات کی کثرت میں وحدت کا اصول ہے جس سے یہ کثرت ایک دوسرے سے مربوط ہے بلکہ اسی طرح ہماری داخلی دنیائے شعور میں بھی یہ کثرت تجربات میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے باعث علم کی تحصیل ممکن ہوتی ہے۔

(۱۳) افلاطون نے عین خیر کی تشریح کے لئے اس کا دوسرے اعیان سے تعلق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختلف علوم اور فلسفہ میں ایک قسم کا رابطہ ہے۔ ہر علم زندگی کے ایک خاص پہلو کا خصوصی نقطہ نگاہ سے مطالعہ کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ واقعات و حادثات، مشاہدات و تجربات کی کثرت میں ایک ایسا اصول تلاش کرے جس سے اس کثرت میں وحدت پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ وحدانی اصول باوجود اپنی عمومیت کے زندگی کے باقی پہلوؤں سے بالکل بے تعلق ہوتا ہے۔ یہی حال دوسرے علوم کا ہوتا ہے کہ وہاں بھی ہر جگہ ایک ایک وحدانی اصول کارفرما ہے جو باقی علوم سے بالکل علیحدہ اور غیر مربوط ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ زندگی اور کائنات میں ہم آہنگی اور یکسانیت ہے اور باوجود اشیاء و واقعات کی کثرت کے یہ خارجی دنیا ایک وحدت ہے، اس لئے ان تمام مختلف علوم کے وحدانی اصول بھی کسی بلند تر اصول واحد کے متفرق پہلو ہیں اور یہی بلند تر اصول واحد افلاطون کا عین خیر ہے۔ جو خالص فلسفہ کا موضوع ہے۔ کوئی انسان بھی کثرتوں اور نچلے درجوں کے وحدانی اصولوں سے مطمئن نہیں ہو پاتا، اس کے دل میں ایک عمومی، ابدی اور بلند ترین اصول کے جاننے اور اپنانے کی تمنا موجود رہتی ہے[۲]۔ جب کسی انسان کو یہ میسر آجاتا ہے تو اس کی نگاہ میں آفاقی وسعت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے، یہ این و آں کی دنیا، یہ تغیر و ثبات، مکان و زمان کے حدود اس کے لئے ہیچ ہو جاتے ہیں۔ وہ معروض و موضوع کی تقسیم، مادہ اور روح کی تفریق، اس دنیا اور اُس دنیا کی تمیز سے بالا ہو جاتا ہے۔ یہی شخص حقیقی معنوں میں فلسفی ہے جو اس ارضِ خاک پر نورِ مجسم بھی ہے اور حاکم مطلق بھی۔ اس کے باعث اس کائنات میں حقیقی امن و سکون، انسانی زندگی میں حقیقی راحت اور سعادت اور معاشرتی زندگی میں استحکام اور اطمینان پیدا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہم اس بلند ترین تصورِ خیر کی منطقی تعریف بیان نہیں کر سکتے (اور اس کے باوجود وہ ایک اخلاقی حقیقت ہے جس کی مدد سے ہی تمام اخلاقی اعمال کی تشریح ممکن ہے) کم از کم ہم سلبی طور پر اس کو چند ایسے تصورات سے متمیز کر سکتے ہیں جو بعض دفعہ خیر کے مترادف

---

[۱] مکالمہ جمہورت ۵۰۸ اور مابعد دیکھئے جو ویٹ کا ترجمہ مکالمات جلد اول صفحہ ۷۰۷ مابعد

[۲] دیکھئے کیرڈ کی کتاب یونانی فلسفہ میں دینیاتی فکر کا ارتقا

سمجھے جاتے ہیں۔ مکالمہ جمہوریت (۵۰۵) میں افلاطون خیر کے متعلق تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لذت نہیں کیونکہ لذت میں ہم نیک و بد کی تمیز کر سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ علم بھی نہیں جیسا کہ عام طور پر علم کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ وہ کونسا علم یا کیسا علم ہے جو خیر کہلانے کا مستحق ہے؟ اس سوال کے جواب میں آخر کار یہی کہنا پڑے گا کہ وہ علم خیر ہے جو خیر کے متعلق ہو اور اس دوری تعریف سے کوئی فائدہ متصور نہیں ہو سکتا۔ کیا اثباتی طور پر اس مسئلہ میں کچھ کہا جا سکتا ہے؟

جب یہ بلند ترین عین خارجی دنیا میں اور اسی طرح دوسرے اشخاص کی سیرت میں منعکس ہوتا ہے اور مختلف حالات و واقعات، اعمال و کردار میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو اس کا نام حسن ہے۔ چنانچہ مکالمہ سیمپوزیم (۲۱۱) میں افلاطون نے انسانی روح کے ارتقاء کا حال پیش کرتے ہوئے اسی خیال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک حسین شکل روح کے سامنے جلوہ ریز ہوتی ہے۔ اس کا مقابلہ وہ دوسری صورتوں سے کرتی ہے اور اس طرح درجہ بدرجہ حسین۔ اعمال اس کے سامنے متشکل ہونے شروع ہوتے ہیں۔ ان اعمال کے مسلسل مشاہدہ اور مقابلہ سے ترقی کرتے ہوئے وہ حسین تصورات تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد حسن مطلق کے مشاہدہ کی منزل آتی ہے۔ اس کے بعد اس حسن مطلق کی مادی صورتیں اس کے لئے ہیچ ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ ارتقاء کی منازل ہیں جن کو ہمارے صوفیا نے حسن مجازی اور حسن حقیقی کے نام سے ذکر کیا ہے۔ تمام انسانی کوششوں کا بدعا مقصد یہی حسن مطلق ہے لیکن بعض دفعہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے بے شمار درمیانی منازل اور واسطوں سے عبور کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہی منزلیں حسن مجازی کی ہیں۔ کبھی کوئی حسین شکل خواہ انسانوں میں ہو یا خارجی کائنات میں دیکھنے والے کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید اسی مادی صورت کا عاشق ہے۔ لیکن پھول یا انسان تو محض اس حسن مطلق کا ایک خارجی پہلو ہے، ایک لباس ہے، ایک پردہ ہے جس کے پیچھے اس متلاشی انسان کی قلبی آنکھ حقیقت کا نظارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس مسلسل تگ و دو اور تفکر کی گہرائی و وسعت سے آخر کار وہ ان مادی مظاہرات سے بے نیاز ہو کر حقیقت مطلقہ کا نظارہ کر لیتا ہے۔ . . . . . یہ حقیقت مطلقہ حسن مطلق بھی ہے اور خیر مطلق بھی۔ اس کے بعد اس کے قلب میں جمود و سکون پیدا نہیں ہوتا، محض مفعولی اور انفعالی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس کے تمام رگ و پے میں ایک تخلیقی اور فعالی جذبہ نمودار ہوتا ہے جس سے اس کی تمام اخلاقی قوتیں اس ایک مقصد کے حصول میں مرتکز ہو جاتی ہیں کہ اس مادی دنیا کے تمام پردے جو اس کی آنکھوں سے اٹھ چکے ہیں باقی تمام انسانوں کے لئے بے کار ہو جائیں اور وہ بھی اس طرح حقیقت و حسن و خیر مطلق کا مشاہدہ کر سکیں جس طرح اس نے کیا ہے۔ اس طرح افلاطون کا عین خیر کا تصور مذہبی اور اخلاقی زندگی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

افلاطونی فلسفے میں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ یہ ہے کہ اس عین خیر اور خدا میں کیا تعلق ہے؟ کیا یہ دونوں علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے ہیں یا محض ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں؟ افلاطون کے اپنے الفاظ جو اس نے عین خیر اور خدا کے